ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

اکیسویں صدی کے اُردو افسانوں میں سماجی شعور

ڈاکٹر منزہ منور
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
وسیم ارشد
اسسٹنٹ لیکچرار، شعبہ اُردو، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور
محمد اکرام الحق
سینئر لیکچرار، شعبہ مینجمنٹ سائنسز، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

Abstract:
In the 21st century, we are witnessing the collapse of societies, there is also an active politics that plays the most important and intense role. How political tactics are working on the global scale and what is the nature of their role in their particular local environment and how they are influencing the individual and society, this topic was also especially in front of fiction writers. The creative perspective of Urdu fiction in the 21st century is a reflection of the fact that the experiences that have come out in this genre in this period are not only proof of the full functionality of the literary genre, but also the contemporary sensibility, social consciousness, cultural distinction and human thought. They also have depth and breadth of feeling. These experiences bear witness to the fact that our creators are fully in tune with their times and that quest for artistic creation is fully employed here, which is a manifestation of the distinction of an era.

Keyword:
اکیسویں صدی، جنگی حالات، دہشت گردی، جاگیر دارانہ نظام، سیاسی کشمکش

اکیسویں صدی اپنے آغاز ہی سے نئے رویوں نئے امکانات نئے زاویہ نگاہ اور معاملات سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئے طرز عمل کی ترجمانی کرتی ہے۔ ابھی چند برس قبل سیاسی اور سماجی کینوس پر دہشت گردی سے جڑے نے انفرادی واجتماعی انسانی رویوں نے جنم نہیں لیا تھا جنہیں پہلے سے موجود دہشت گردی جنم دینے لگی تھی اور پھر مقامی اور بین الاقوامی کینوس دہشت گردی اور اس کے شکار طبقات کے دو مختلف حصوں میں بٹ گیا، نہ صرف مذہبی شدت پسندی نے اس قانون پر سرخ رنگ بکھیرا بلکہ غیر مذہبی کہلانے والی لبرل قوتوں نے بھی مل کر لاکھوں بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔

اب ہم اگر عالمی قانون سے صرف نظر کر کے مقامی قانون اس پر توجہ مرکوز کر دیں تو نئی صدی کے نئے سماجی رویے ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ مذہبی اور غیر مذہبی کی تفریق اب لبرل فکر سے نفرت اور مذہب دشمنی کے رویوں میں منقلب ہو گئی ہے۔ اظہار اور ڈائیلاگ کے مواقع بے تحاشہ بڑھ چکے ہیں جس کی وجہ سے مختلف زاویہ ہائے نگاہ سامنے آرہے ہیں اور ایک اجتماعی سوچ کی طرف جانے والا راستہ پیچیدگیوں کی دھند میں اوجھل ہو چکا ہے۔ نیم سرمایہ دارانہ رویے بھی اسے مزید استحصال برداشت کرنے کے لیے تیار کرتے رہتے ہیں۔ عسکری وسیاسی مفادات کی سیاہ چادر نے اس پر ظلم کی سیاہی مسلط کر رکھی ہے۔ اس سے چھٹکارا کیسے پایا جائے کہ دہشت گردی کے ہر بڑے واقعے کے بعد عام آدمی کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی آزادانہ نقل و حرکت میں مزید رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کے جان و مال کے تحفظ کا گراف مزید گر جاتا ہے اس کی بے بسی اور رسوا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس دہشتگردی سے باہر کے ذریعے مزید اختیارات سے لیس ہو جاتی ہیں۔ عام آدمی ان حالات میں مستقل ذہنی دباؤ کا شکار رہتا ہے عدم برداشت اس کا طرز عمل ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ لفظ اور معنی کے رشتہ میں لغوی معنٰی ایک طرف لیکن ثقافتی معنی کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا:

> ''اس کتاب میں موجود کہانیوں کے متون ان کے تناظر بیان واسلوب اور ہیئت و تکنیک میں تنوع سے نئی صدی کے مقامی اور بین الاقوامی مسائل اور تخلیقی رویوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔''(۱)

افسانہ نویس نعیم بیگ نے اس کا تعارف پیش کرتے ہوئے لکھا ہے:

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

"اس صدی کے اوائل سے عصری ارتقائی مراحل میں اردو ادب کو جو روایتی خطرات درپیش تھے ان کا سدباب کرتے ہوئے ان ادیبوں نے عالمی تناظر میں عہد حاضر کے مناظر کو عمدگی سے پلیٹ کر کے دکھا دیا۔ اس لئے آج کے ادب اور تقاضوں میں کلاس کی شعور کے ساتھ جدید فکری رجحانات رات کی آمیزش کو میں ایک قرار واقعی سی کوشش کروں گا جو اردو ادب کے افسانے کو بددل اور بے رنگ نہیں ہونے دیتی۔"(۲)

نئی صدی کے افسانے اپنی جگہ جتنے دلچسپ ہیں اتنے ہی ایک عام قاری کے لیے ان میں وہ کشش موجود ہے جو ہمارے معاشرے کی عمومی نفسیات کو اپیل کرتی ہے۔ لیکن جب ہم فکر کی بات کرتے ہیں اور اس کے بال پر مرتبہ کو عام آدمی کی دلچسپی ایک طرف رہ جاتی ہے بلکہ فکری حوالوں سے بات شروع ہو جاتی ہے۔ اظہار رائے کی آزادی جتنی بڑھ چکی ہے اتنی ہی جان لینے کی آزادی بھی بڑھ گئی ہے۔ عام مقامی انسان بہت سارے شہری مسائل میں بری طرح الجھا ہوا ہے اور دیہی انسان بدستور جاگیر دارانہ سماج کے قبضے میں ہے۔ اس طرح" گل کی قیمتیں" "تابوت" "بہرام کا گھر" "پورٹریٹس" "کباڑیا" "بین کرتی آوازیں" "ایک رات کی خاطر واپسی" "پلیٹ فارم" "قیمتی تابوت" "رکھوالی" "دستر خواں" "سالم روٹی اور کہانی" یہ وہ افسانے ہیں جو نہ صرف روایتی طرز ہار میں لپٹے ہیں بلکہ روایت کی دھند میں اپنے عصری اہمیت اور جدید ثقافتی انسلاک سے بھی محروم ہے۔ ان میں سے کسی میں مصروف کلاسیکی شعور ملتا ہے۔

اردو ادب کے حوالے سے جب ہم اکیسویں صدی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ایک بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ شاعری کی نسبت فکشن نگار خال خال تھے۔ نئی صدی میں داخل ہوتے ہوتے اس نے بہت سارے نئے افسانہ نویسوں کو اپنی طرف راغب کیا ہے اور فکشن لکھنے کا رجحان پھر سے بڑھا ہے لیکن ان کے سامنے معیار کا سوال بھی ان کھڑا ہوا ہے۔ پروگریسیو اردو رائٹرز گلڈ جو حال ہی میں سوشل میڈیا کے توسط سے قائم ہوا ہے اس نے پہلی بار اس بڑھتے ہوئے رجحان کو دستاویزی شکل دینے کے لیے افسانوں کے ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کیا ہے اس مجموعے میں جغرافیائی حدود سے ماوراء اُردو دنیا کے نئے اور پرانے لکھنے والوں کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں روایتی، علامتی اور تجریدی انداز ملتا ہے۔" برف کی عورت" کا موضوع چونک آتا ہے لیکن طرز اظہار اتنا متنوی ہے کہ اس کے بوجھ تلے کہانی بن کر سی رہ گئی ہے۔ "نکیل" کا تناظر روایتی مابعد نوآبادیاتی ہے تاہم اپنی لغت اور طرز ہار میں تازگی کا حامل افسانہ ہے آپ نے اس تناظر کو پیش کرتے ہوئے ادھورے پن کا شکار نہیں ہوا۔" ڈولی" اس مجموعے کی سب سے حیران کن بات ثقافت اور تاریخی تناظر کو پوری قوت سے زندہ کرتا ہے۔ فرخ ندیم کا یہ کہنا بجا ہے:

"سنجیدہ افسانہ نگار اپنی معاشرت کا شعور رکھتے ہوئے کہانی میں وہ پروسیس دکھاتا ہے جس سے انسانی زندگیاں متاثر ہوتی ہیں۔ عمل اس افسانے کا حسن ہے۔"(۳)

بلاشبہ اردو افسانے نے روز اول ہی سے ایسے آشوب دیکھے کہ اسے ایک لمحے کیلئے سکھ کا سانس لینا نصیب نہ ہوا لیکن اس کی جرت رندانہ نے کبھی زندگی کو بوجھ سمجھ کر اس لیے کوڑا دان تلاش نہیں کیا بلکہ اسے ہتھیار بنا کر وقت اور حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کرتا رہا اور اپنی توانائی کو برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش میں اپنا تشخص بھی زندہ رکھا۔ اگرچہ وقتی طور پر سنگین حالات کے زیر اثر کہیں قدم لڑکھڑائے ضرور لیکن اس نے خود کو گرنے نہیں دیا۔ اس حوالے سے اگر ہم ابتدا ہی سے اردو افسانے میں سیاسی اور سماجی حالات کے پیش نظر اٹھنے والے رویوں اور رجحانات کا جائزہ لے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں ہی سنگین حالات کے باوجود کئی ایسے قلم کار جن کی محنت اور لگن نے نومولود افسانے کو وہ توانائی اور طاقت عطا کی جو آج تک اس کے استعمال میں ہے۔ انہوں نے اپنا رشتہ زمینی حقائق سے قائم کیا اور اور زندگی کو جیسا دیکھا محسوس کیا اس پر قلم اٹھایا۔ اس لئے ان کے افسانوں میں اس وقت کے سماج کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ یوں افسانے نے اپنے دور اولین ہی میں ہندوستان کے مظلوم طبقے خاص طور پر بے بس انسانوں کی زندگی میں پیش آنے والے المیوں کو موضوع بنالیا۔

گویا کہ ان افسانوں میں معاشرتی ناہمواریوں کو مد نظر رکھ کر ان کی اصلاح کے پہلو کو اجاگر کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کے متوسط طبقے کے مسائل اور ان کی معاشی اور معاشرتی الجھنے سامنے لانے کی کوشش بھی کی گئی:

"ہمارے یہاں افسانے کی پیدائش ہیں اس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے اور اس سے اور مستفیض ہونے لگے تھے مگر بھی ادب کا مطالعہ نیا شعور اور آگاہی سب سے زیادہ اسی صنف میں ظاہر ہوئے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

کیونکہ مغربی ادب سے ظاہر ہونے سے نئی نئی تحریکوں، رجحانات، تکنی کوں اور نئے نئے طرز اپنانے کا شعور افسانے کے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوا اور ہمارے افسانے بھی مغربی افسانے کے دوش بدوش ہی ترقی کی منزلیں طے کیں۔"(۴)

ان افسانہ نگاروں نے فکر و شعور اور تکنیک کے ساتھ موضوعات بھی وہی استعمال کیے جو مغربی افسانہ نگاروں کے زیر قلم ہے کیونکہ کہانی سنانے کی ایک بات اور مضبوط روایت خود پہلے ہی سے ہمارے ہاں موجود رہی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ مغربی تراجم سے اردو افسانہ نگاروں کو نئے فنی معیارات سے روشناس ہوئے اور مغربی انداز فکر سے عوام الناس کے اذہان و قلوب کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔اس کوشش سے معاشرے کے ڈھانچے میں کوئی مثبت منفی تبدیلی آئی ہے یا نہیں یہ ایک طرف لیکن اردو افسانے کے ڈھانچے کو مضبوط بنیادیں ضرور ملیں۔ ترقی پسند روح و جان کے حامل افسانہ نگاروں نے معاشرے کے جمود کو توڑا اور معاشی، معاشرتی اور جنسی حوالے سے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جو اس سے پہلے شجر ممنوعہ سمجھے جاتے تھے۔اس رجحان کے تحت جہاں معاشرے کو بیدار کرنے کی سعی کی گئی وہاں افسانے میں تکنیکی حوالے سے بھی کئی تجربات سامنے آئے جن میں شعور کی روح کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس تکنیک کی مدد سے نفسیاتی الجھنوں کے شکار انسان نے اپنے ظاہر اور باطن کے تضاد کو خود کلامی کے ذریعے بیان کیا جس کے تحت بہت تلخ حقائق سامنے آئے اس نے نہ صرف اپنے مخصوص حالات میں افسانہ نگاروں کو متاثر کیا بلکہ آنے والے دور میں بھی اس کی بازگشت کسی نہ کسی صورت سنائی دیتی رہی۔ڈاکٹر خالد علوی کے بقول:

"انگارے کی اشاعت محض چند افسانوں کے ایک مجموعہ کی اشاعت نہ تھی بلکہ فرسودہ روایات اور رسمی قیود سے بغاوت کا مہذب اظہار تھی،ایک نئے "عہد نامے "کا اعلان تھی۔"(۵)

اس رجحان کے تحت اردو افسانے کی تاریخ میں کرداری افسانوں کی ایک زوردار لہر پیدا ہوئی جن کی مدد سے افسانہ نگار نے معاشرے میں ہر طرف پھیلی ہوئی برائیوں کے باوجود آدمیت کو ڈھونڈ نکالا یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ :

"تقسیم ملک نے معاشرے میں لاتعداد کردار ابھار دیے اور افسانہ نگار کی نظریں ان پر مرکوز ہونے لگی جس کے نتیجے میں کردار نگاری کی ایک بھرپور روش وجود میں آگئی.اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے ارمنی پہلو کو قریب سے دیکھنے کا رجحان بھی عام ہو گیا۔"(۶)

افسانوں کے موضوعات میں کسی حد تک ایک ثانیہ سے بچنے اور مغربی ادب سے فکری وابستگی قائم رکھنے کے لئے یہ عمل ضروری تھا۔اس کے علاوہ صنعتی انقلاب اور جدید سائنسی دور نے بھی جب حیات انسانی کو مشینی دور میں داخل کر دیا تو اظہار کے سپاٹ انداز بھی پیچیدہ ہوتے چلے گئے گویا خارج کا جبر جب اندر اتر گیا تو اس آگ کو بجھانے کے لئے افسانہ نگار کو بلواسطہ اپنا مدعا بیان کرنا پڑا۔اندر اور باہر کے اس جہنم کو جب انتظار حسین نے بنایا تو شعوری طور پر ان کے فن کے سرے ماضی اور تاریخ سے جڑ گئے اور ان کے ہاں علامت اور تہذیبی بازآفرینی کے ساتھ کی آگہی کا نقارہ بجایا۔

"اجودھیا" اور "آخری آدمی" ان کے ایسے افسانے ہیں جن میں فسادات کا تذکرہ بھی ہے اور آدمی کے روحانی اور تہذیبی زوال کی داستان بھی ہے۔ان کا افسانہ "ہمسفر" میں موجود ہے سمتی دراصل اپنی شناخت اور تلاش کا استعارہ ہے ایک طرف انسانی عروج کی بالادستی اور باتیں کر کے زندگی کے خوشنما رنگوں کو سامنے لاتا ہے تو دوسری طرف ان پرانی بستیوں کے نوحے سناتا ہے جن میں نوح انسانی ایک لمبے عرصے تک ذلت، محرومی اور نفرت کی آگ میں جلتی رہی۔ایک طرف انسان کی فکری اور علمی وسعت کو سراہتا ہے تو دوسری طرف منفی قوتوں سے نبرد آزما نظر آتا ہے لیکن جب یہ دنیا ایک گلوبل ولیج میں تبدیل ہو گئی تو گلوبل مسائل تمام انسانوں کو یکساں طور پر درپیش آئے۔یہی وجہ ہے کہ آج کے افسانہ نگاروں نے انتہائی متوازن اور مثبت انداز اختیار کرتے ہوئے دوسرے ادوار کے افسانہ نگاروں کی طرح انحراف کو اپنا شیوا نہیں بنایا بلکہ کشادہ دامنی کا ثبوت دیتے ہوئے گذشتہ و آئندہ تمام مضامین، موضوعات، تکنیک اور اسالیب کے لیے جگہ فراہم کی۔سید محمد اشرف کے بقول:

"مابعد جدید افسانے کی ایک صفت اور بھی ہے کہ یہ سماجی عوامل سے آنکھیں نہیں چراتا ساتھ ہی فرد کی تنہائی سے بھی اسے کوئی بیر نہیں ہے۔ موضوعات کا انتخاب اس کا مسئلہ نہیں اور کسی بھی تکنیک کا استعمال اسے کسی تعصب میں گرفتار نہیں کرتا۔دراصل مابعد جدید افسانے کا پورا رویہ انحراف سے زیادہ انجذاب کا عکاس ہے۔"(۷)

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

یہی وجہ ہے کے نئے افسانے میں نئے زمانے کی حیثیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے اور اردو افسانہ یہ المناک صورتحال سامنے لانے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کہ آج کا ترقی یافتہ انسان گلوبلائزیشن کے نعرے تو لگاتا ہے لیکن طبقاتی خانوں میں تقسیم انسانیت کو یکجا کرنے میں تاحال کامیاب نہ ہو سکا۔ دور جدید میں انسان نے معاشی اور اقتصادی ابتری سے نکالنے کے لیے کبھی ضرورت کے تحت تو کبھی بلاضرورت ترقی یافتہ ممالک میں سکونت اختیار کرلی اور خود کو ہجرت اور جلاوطنی سے دوچار کیا تو وہ ایسے بلند و بالا عمارت کا مکین بنا جن میں دروازے اور کھڑکیاں ہی نہیں تھیں۔ اس نئے ماحول میں شکست وریخت کا عمل تیز لیکن غیر محسوس انداز میں رشتوں کو گھن کی طرح چاٹتا رہا، جس سے نئے عہد کے افسانہ نگاروں نے تخلیقی قوت سے محسوس کیا۔ اس لیے مابعد جدید افسانہ جہاں انسان کی شناخت تہذیب کی باقیات سیاسی جبر عدم تحفظ کے احساس کی بات کرتا ہے وہاں سیاسی بدعنوانی و سماجی ناہمواریوں فرقہ وارانہ فسادات خاندانوں کی شکست وریخت اور شہری زندگی کے مسائل کو بھی موضوع بناتا ہے۔ آج اردو کے بے شمار افسانہ نگار دیار غیر میں بیٹھ کر افسانہ تخلیق کر رہے ہیں۔ جن میں مختلف تہذیبوں کی آمیزش کو پیش کیا جا رہا ہے، اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہو گا کہ وہ محض افسانہ نہیں لکھ رہے بلکہ افسانے میں عصری آگہی کا ثبوت دیتے ہوئے زندگی کی تنقید پیش کر رہے ہیں۔

اکیسویں صدی انسانی تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہے جس میں تمام تر ترقیوں، سائنسی ایجادات اور خلاؤں کی تسخیر کے ساتھ ساتھ نت نئے آلات جنگ اور چونکا دینے والی خباثتوں کو تقویت ملی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مذہب جو امن کی علامت ہے اور امن جو انسانیت کا خواب ہے کہ نام پر تمام دنیا میں بالعموم اور برصغیر میں بالخصوص ایسے ایسے اقدامات ہو رہے ہیں کہ مذہب ایک طعنہ بن گیا اور امن ایک خوف ناک سانپ جو انسان کو آہستہ آہستہ نگل رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو افسانے کی عمر اتنی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود:

> ''اس مختصر سی عمر میں اردو افسانے نے کیا نہیں دیکھا۔ آشوب، زیست کا کون سا ذائقہ نہیں چکھا اور جبر و استحصال کے کس حربے کا مشاہدہ نہیں کیا؟ اس لئے میرے خیال میں مختصر افسانہ ادب کی تمام اصناف پر اس لئے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں ہماری قومی تاریخ کی ایک دستاویز بننے کی اہلیت بھی ہے اور فنی رچاؤ کے وہ تمام انداز بھی جو کسی صنف ادب کو قلیل المیعاد بننے سے بچا لیتے ہیں۔''(۸)

آج اردو ادب تیزی سے ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ جہاں ایک طرف نت نئی اصناف وقت کی ضرورت کے تحت پیدا ہو رہی ہے تو دوسری طرف پہلے سے موجود اصناف میں فنی اور فکری سطح پر انقلابی تبدیلیاں دونوں سطحوں پر ہو رہی ہے یعنی ادب تخلیق کرنے والے اور ادب پڑھنے والے اس سے براہ راست متاثر ہو رہے ہیں۔ پوری دنیا میں آئے روز تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ ادب میں نئے نئے تجربات کیے جا رہے ہیں۔ دنیا ارتقائی عمل سے گزر رہی ہے۔ اس لیے زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلیاں واقع ہو رہی ہیں اور رجحانات بدل رہے ہیں۔ علم و آگہی میں اس قدر وسعت آئی ہے کہ وہ ان گنت پرتوں میں منقسم ہو گئی ہے اور ہر پرت کا اپنا فلسفہ ہے۔ اس لیے فلسفہ کی پرانی حیثیت پر اصرار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی کچھ معاملہ ادب کا ہے ہر دور کے اپنے تقاضے اور ضرورت ہوتی ہے۔

اکیسویں صدی میں تہذیبی تصادم کے باعث موجودہ معاشرہ بے شمار تہذیبی، سیاسی، تمدنی اور وجودی کرائسز کا شکار ہوتا جا رہا ہے دوسری طرف اردو میں جدیدیت سے منسوب ادبی رجحانات ایک بے جان نحیف لکیر میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ آج ان افسانہ نگاروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی ہے جو ہیئت، چستان اور نثری نظم کو خاص افسانہ قرار دیتے ہیں۔ دوسری طرف مابعد جدیدیت بطور رجحان تھیوری اور سماج کے نئے مباحث سامنے لا کر جدیدیت کی نحیف لکیر کو کال عدم قرار دے رہی ہے۔ آج کا قاری جدیدیت کے چستان کو رد کرتا ہے اور زندگی اور اس کی ذات سے وابستہ فکشن پڑھنا چاہتا ہے، خواہ پھر وہ علامتی، بیانیہ، تمثیلی، روایتی یا غیر روایتی پلاٹ میں تحریر کیا گیا ہو، اصل چیز تو افسانہ ہے، کہانی ہے، پیش کش ہے۔

ملک کے مختلف خطوں، دیہات کے حسین مناظر، موسم، فصلیں، رہن سہن، تہذیب و تمدن، میلے ٹھیلے، رسوم و رواج، جذباتی الجھنیں، نفسیاتی مسائل اور معاشی مسائل وغیرہ جب تک انسان کے سامنے نہ ہوں اس وقت تک اس ملک کا حقیقی روپ سامنے نہیں آسکتا۔ آج کے افسانہ نگار اپنے افسانوں میں سماجی حقیقت نگاری کے ذریعے عوام کے کئی مسائل کو سامنے لائے۔ انہوں نے اس وقت لوگوں کے سماجی مسائل کا بغور مشاہدہ کیا جس پر وہ احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرف تہذیبی شعور کے در کھولتی ہے

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

تو دوسری طرف وہ اپنے سماجی شعور کے پیش نظر معنویت سے بھرپور حقیقی زندگی کی داستان پیش کرتے ہیں، جس میں وہ اپنی مٹی کے بو باس سے جڑے ہوئے ہیں۔ان کے تخیل کی رفعتیں اپنے سماج و تہذیب میں اپنی جڑیں پیوست کیے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں اور ادب میں نفسیاتی تنقید کے حوالے سے بھی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔ان کے افسانوں میں فرد کی نفسیاتی کیفیات کا عنصر واضح انداز میں جلوہ گر نظر آتا ہے کرداروں کی داخلی زندگی کی مخصوص عکاسی نے ان کی جذباتی اور نفسیاتی کیفیت کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات میں خاصا تنوع ملتا ہے وہ زندگی کے سیاسی، سماجی، معاشرتی، نفسیاتی اور جنسی مسائل کو مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں تب اسے افسانے کے فارم میں ڈھالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے واقعات بھی معاشرتی سطح کے ساتھ ساتھ ایک نفسی اور داخلی کیفیت کے حامل نظر آنے لگتے ہیں۔ان کے افسانے ہماری بہت سی نفسیاتی الجھنوں اور جنسی گمراہوں کا جواز تلاش کرتے ہیں جس میں انسان جائز خواہشات کی تکمیل آسانی سے کر سکے۔وہ معاشرے اور اس میں بسنے والے انسانوں کو صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔

سلیم اختر کے افسانے ہماری معاشرتی زندگی کے آئینے ہیں۔ابتدائی افسانوں میں کچھ ایسے افسانے بھی ملتے ہیں جن میں جذباتی اور رومانی موضوعات ملتے ہیں اور جنسی تجربے کی خواہش بھی ملتی ہے۔اس کے بعد وہ معاشرتی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے اخلاقی، سماجی اور معاشرے میں پھیلے ہوئے جنسی مسائل اور گمراہیاں ان کی توجہ کا مرکز بنے۔ایسے افسانوں میں ''رن مرید'' ''گندہ خون'' ''بیلنس شیٹ'' ''بیوی کا الاؤ'' ''کاٹھ کی عورتیں'' جیسے افسانے شامل ہیں۔

سلیم اختر کا افسانہ ''بکری'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ماں بننے سے محروم ہے۔اس کی ساس ہر وقت نئی بہو لانے کی فکر میں رہتی ہے، جس سے اسے اپنی کم مائیگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔یہ ہمارے معاشرے کے ہر گھر کی کہانی ہے جس میں اولاد کا نہ ہونا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح'' جلے پاؤں کی بلی'' ''بشیرے دی جورو'' ''کھونٹا'' نفسیاتی مسائل پر لکھے گئے افسانے ہیں۔ان افسانوں میں کسی ابنارمل صورتحال کی بدولت احساس کمتری حسد اور دیگر نفسیاتی الجھنوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔گانا چور اور جن ہتھیلیوں پر سرسوں بولتی ہے اقتصادی مجبوریوں کے تحت ابھرنے والے معاشرتی مسائل کی کہانیاں ہیں۔خواہشات کی تکمیل میں انسان کی بے بسی کی تصویریں ان کہانیوں میں دکھائی دیتی ہیں۔

معاشرتی جنسی نفسیاتی اور معاشرتی مسائل جو قدم قدم پر بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان کہانیوں کا موضوع ہیں۔یہ کہانیاں اس پورے طبقے کی عکاسی کرتی ہیں کہ اس طرح انسان اقتصادی مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنا رویہ تبدیل کر لیتا ہے۔ اکیسویں صدی کے افسانوں میں گھریلو زندگی کی تلخیاں، محبت، نفرت کے جذبے اور معاشرتی رویے ملتے ہیں جس میں نہ صرف ان کے معاشی اور سماجی مسائل کو پیش کیا بلکہ ان کی نفسیاتی الجھنوں کا سراغ بھی لگایا اور ان کی زندگیوں سے وابستہ مسائل کا تجزیہ بھی کیا۔ڈاکٹر اے۔بی اشرف لکھتے ہیں:

> ''ان کہانیوں میں ٹریٹمنٹ کے علاوہ کردار نگاری کا کمال بھی دکھائی دیتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر کردار کو پینٹ کرتے وقت انسانی زندگی کے گہرے مشاہدے اور تجربے کا ثبوت دیتے ہیں۔یہ کردار اتنے بھرپور اور جیتے جاگتے ہیں کہ ان کو فراموش کرنا آسان نہیں ہے۔''(۹)

اکیسویں صدی کے افسانہ نگار اس بات اور روایت کے امین ہیں کہ جسے واقعیت نگاری اور حقیقت پسندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔بسیاری نویسی کے باوجود انہوں نے فن کو معیار سے گرنے نہیں دیا۔انہوں نے اپنے نفسیاتی مطالعہ کی بنا پر اردو افسانے کی نفسیاتی روایت میں خوبصورت اضافہ کیے اور انہوں نے اپنی تنقید کی طرح افسانے کو بھی نیا انداز دیا۔

محمد حمید شاہد کے افسانے بھی پڑھنے میں بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ان کے ہاں سیاسی، سماجی اور معاشرتی شعور بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ان کے افسانے کا سفر ''برف کا گھونسلہ'' سے شروع ہوتا ہے اور '' سورگ میں سور'' جیسے بڑے افسانے تک پہنچتا ہے۔بے شک اس افسانے کو ہم منٹو، بیدی اور انتظار حسین کے ایسے ہی افسانوں کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں۔اس افسانے میں بھیڑ، بکریوں، کتوں اور سوروں کی کہانی جس طرح آخر میں ایک علامت کا روپ دھارتی ہے کہ پڑھنے والے کے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

حمید شاہد بھی اکیسویں صدی کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے انسانی سائیکی کا جو گہرا مطالعہ کیا ہے اس میں انہوں نے اس کی کہانیوں کے کرداروں کو شکستگی اور بے سمتی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ان کی کہانیوں میں اکتائے ہوئے دلوں اور تھکے ہوئے جسم میں ایک نئی روح اور حرارت اور ایک نیا جذبہ اور نیا لہو پیدا کرتی ہیں اور قاری کو ایک نئی طرح کی لذت اور حس طاقت سے ہمکنار کرتی ہے۔اس میں محمد حمید شاہد کی موضوعی گرفت اور سرچشمہ انسانی جبلتوں کا شعور ہے جو باطنی صداقتوں سچے اظہار و بیان سے پھوٹتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانی دل کو بھلی لگتی ہے۔

یہ افسانہ نگار اپنی ہر کہانی کے لئے الگ کلچر بناتا ہے اور ان کہانیوں میں کلچر موضوعات کے تنوع اور صورت حال کی تبدیلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ان کی انفرادیت کہانی کے علامتی اظہار اور بیانیہ انداز کے درمیان ایک ایسا پل بناتا ہے جس پر چلنے والا قاری انسان کی ذات اور کائناتی ماحول کی تفہیم کے مرحلے سے باآسانی گزر جاتا ہے۔دوسرا عنصر یہ ہے کہ میں چاہت کی کہانیوں میں وہ کردار صورتحال اور تہذیبی و سماجی عناصر منکشف ہوتے ہیں جنہوں نے زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔خوبصورت بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے ہمیں اشاروں ہی اشاروں میں اس جہنم سے نکلنے کی راہ بھی دکھائی ہے۔بقول افتخار عارف:

> ''محمد حمید شاہد بلاشبہ خالد حسین، منشایاد، اسد محمد خان، مظہر الاسلام، رشید امجد، مشرف احمد اور احمد جاوید کے بعد اردو افسانے کے منظر نامے میں ظہور کرنے والی پیڑھی میں ایک معتبر اور نہایت لائق توجہ افسانہ نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔''(۱۰)

اُردو افسانہ اپنے سیاسی واقعات اور سیاسی و سماجی صورتحال سے جڑا ہوا ہے اور جس شدت احساس سے اس نے عصری سیاسی واقعات کو موضوع بنایا ہے اس میں گیارہ ستمبر کا واقعہ بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔حمید شاہد کے سیاست و آمریت سے مزین کئی افسانوں کا موضوع 9/11 کا واقعہ اور اس کے بعد کئی عالمی سیاسی صورتحال ہے اس ضمن میں افسانوی مجموعہ '' مرگ زار'' میں شامل افسانے قابل ذکر ہیں جن میں سے ''لوتھ'' ''سورگ میں سور'' ''مرگ زار'' ''موت کی منڈی'' میں اکیلی موت کا قصہ اور ''گانٹھ'' وغیرہ اہم ہیں۔

افسانہ '' مرگ زار'' افغانستان میں جاری وحشت، آمریت، سیاسی استحصال اور انسانی تذلیل کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔جس میں ہلاکت آفرینی کے کئی گوشے نکلتے ہیں۔منشایاد'' مرگ زار'' کے موضوع کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''وہ کہانی جس پر کتاب کا نام رکھا گیا اس کہانی کا موضوع جہاد اور شہادت جیسا نازک مسئلہ ہے جس کی کچھ عرصہ پہلے تک کچھ اور صورت تھی۔اب نائن الیون اور عالمی طاقتوں کی مداخلت سے کچھ اور صورت بن گئی ہے۔''(۱۱)

حمید شاہد نے سیاسی شعور سے مزین افسانہ '' موت کا بوسہ'' میں سیاسی و سماجی اور معاشی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے۔اس افسانے میں یہ باور کروایا گیا ہے کہ انسان کائنات میں اپنی محنت کے بل بوتے پر کتنا ہی بلند مقام حاصل کر لے مگر موت کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔افسانہ نگار نے افسانے میں ایسا کردار پیش کیا ہے جس نے اپنی محنت اور ہمت سے اپنا کردار اور مقام بنایا۔جب موت آئی تو سب کچھ بہا کر لے گئی۔علی محمد فرشی اس کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''موت کا بوسہ میں موت مختلف عصری سماجی، سیاسی و معاشی سطح پر روپ بدل بدل کر وار کرتی ہے اور آدمی اس کے مقابل بے بسی اوڑھ بیٹھا دکھائی دیتا ہے۔''(۱۲)

خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور نظریاتی اور عملی اعتبار سے ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہیں۔خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور اپنے افسانوں کے موضوعات کا انتخاب حقیقی زندگی سے کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں نچلے طبقے کے المیہ جابجا بکھرے پڑے ہیں۔جہاں معاشی مجبوریاں اور دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہے۔بقول سید وقار عظیم:

> ''ہاجرہ کے افسانوں میں موضوع تو عام زندگی کے ہیں لیکن ان کے فن میں عمومیت کہیں نہیں۔فنی نقطہ نظر سے ضروری اور غیر ضروری اہم اور غیر اہم میں امتیاز کرنا جانتی ہیں۔''(۱۳)

ان کی افسانہ نگاری میں ہمیں انسانی جذبات و احساسات کے مسائل اور عادات و خصائل وغیرہ کا گہرا مشاہدہ نظر آتا ہے جس میں خاص طور پر نچلے طبقے کو پیش کیا گیا ہے۔کیونکہ ان دونوں بہنوں کو بچپن میں اس طبقے کی پہچان تھی اور غریب بچوں کے ساتھ کھیلنے کا اور ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔اس سے ان کا فائدہ یہ ہوا کہ

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

جہاں ان کے دل میں سماج کے نچلے طبقے کو اپنے سے کمتر سمجھنا اور ان سے نفرت کرنے کی بجائے ان کے لیے ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا ہوئے وہاں ان کے رہن سہن ان کے کردار، عادات و خصائل ان کے معاشی و معاشرتی مسائل کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ اس عمل نے ان کی نظر بنانے اور ان کے شعور کو سماجی حقائق سے آشنا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ چناچہ انہوں نے اب جب اپنے ان تجربوں اور مشاہدوں کو اپنے افسانوں میں ڈھالا تو ان کے فن کو اعتبار کی روشنی عطا کی اور ہر آن بدلتی ہوئی زندگی کی دھوپ چھاؤں سے آراستہ کیا۔ اپنے ایک مضمون ''ہاجرہ مسرور اور افسانہ'' میں طاہر نقوی لکھتے ہیں:

'' انہوں نے اپنے ارد گرد جیسا ماحول پایا، ویسا ہی اپنے افسانوں میں پیش کر دیا۔ اس بات کو ہم افسانہ نگار کے مشاہدے کی خوبی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔''(۱۴)

خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں عصری شعور کی کسی دور کمی نہ تھی۔ انہوں نے اپنے عصر کے سماجی مسائل اور مشکلات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ہندوستانی معاشرے میں مزدور کسان اور کمزور کی سپاٹ، منجمند اور بے جان زندگی جانوروں سے بدتر ہے۔ غریب، غریب تر اور امیر، امیر تر ہو رہے تھے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے غلامی افلاس اور ذلت سے ہمکنار لوگوں کے اقتصادی مسائل اور استحصالی نظام کی ناانصافیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اظہر قادری اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''خدیجہ مستور کی تخلیقی کاوشیں اس بات کا واضح پتا دیتی ہیں انہیں اپنے ارد گرد کے انسانی مسائل کو ان کے ہمہ گیر تناظر میں دیکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے اور ان سے صحیح نتائج نکالنے کا سلیقہ آتا ہے۔''(۱۵)

اشفاق احمد متنوع جہالت کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے افسانوں میں تصوف کی طرف واضح میلان نظر آتا ہے۔ وہ مخصوص تہذیبی اور معاشرتی طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ افراد کا اضطراب نفسیاتی الجھن اور بچوں کی نفسیات بھی ان کا موضوع رہا ہے۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں ان کے غیر معمولی قوت مشاہدہ فلسفیانہ و تجزیاتی نظر اور گہری بصیرت نظر آتی ہے۔ بانو قدسیہ پر اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب کی محبت کا گہرا اثر ہے۔ ان کے ہاں تصوف اور فلسفہ کی طرف رغبت نظر آتی ہے۔ انسان کے روحانی اور باطنی تجربات کی عکاسی کے علاوہ وہ عورت کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔ لیکن ان کے ہاں مرد کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ غرض اکیسویں صدی کے افسانوں میں سماجی شعور ہر لحاظ سے افسانے کا حصہ بنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''اردو فکشن تنقید''، لاہور، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸، ص:۱۱۷

۲۔ ایضاً، ص:۱۹۲

۳۔ ایم اے فاروقی، ''افسانے کے مباحث''، کراچی، بک ٹائم، ۲۰۱۵ء، ص:۲۱

۴۔ ایضاً، ص:۸۲

۵۔ ایضا، ص:۱۱۲

۶۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، ''نئے تناظر''، لاہور، شرکت پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۱، ص:۵۶۴

۷۔ ایضا، ص:۲۵۲

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۷ء، ص۳۰۔۳۱

۹۔ ایضاً، ص:۴۳۴

۱۰۔ ایضاً، ص:۱۲۰

۱۱۔ انور سدید، ڈاکٹر،، ''مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد''، لاہور، مقبول اکادمی، ۱۹۹۲ء، ص۱۲۶

ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617
Vol.7 No.2, 2024

۱۲۔ ایضاً، ص:۱۳۸

۱۳۔ ایضاً، ص:۱۴۰

۱۴۔ حامد بیگ، مرزا، " اردو افسانے کی روایت"، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۰، ص۳۲۱

۱۵۔ ایضاً، ص:۳۲۱